DATE: 31/7/15

مرثیے کا فن اور تعریف

مرثیہ وہ اہم صنفِ سخن ہے جس نے ہماری شاعری کے دامن کو وسعت دی اور اپنی زبان میں ایسا قیمتی شعری ذخیرہ فراہم کر دیا جو ترقی یافتہ زبانوں کیلئے بھی باعثِ رشک ہے۔

کہا گیا ہے کہ کسی شاعری کی عظمت کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جا سکتا ہے کہ اس کا کتنا حصہ عالمی ادب میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اردو مرثیہ یقیناً اس قابل ہے کہ جسے دنیا کی بڑی سے بڑی شاعری کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔

دنیا کے ادب کا آغاز عام طور پر شاعری سے ہوا۔ اور شاعری میں جو صنف سب سے پہلے وجود میں آئی وہ مرثیہ ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب دل کو ٹھیس لگتی ہے تو زبان سے موزوں کلمات ادا ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے کلمات جن میں شاعری کی کیفیت ہوتی ہے۔ موت پر کہے جانے والے بین اس کی مثال ہیں۔ کسی عزیز کی موت سے زیادہ دل کو تکلیف پہنچانے والی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ حساس دلوں سے اپنے عزیزوں کی موت پر جو پُر درد اور پُر اثر کلمات بے اختیار ادا ہوئے وہ مرثیہ کہلائے۔ اور دنیا کی ہر زبان میں انہیں سے شاعری کا

Scanned by CamScanner

PAGE NO.:
DATE: / /

آغاز ہوا۔ دل سے نکلی ہوئی بات (دونوں) اثر رکھتی ہے اس لئے ہر جگہ مرثیوں کو ایسا قبول عام نصیب ہوا کہ ادھر یہ شاعر کی زبان سے ادا ہوئے اور ادھر لوگوں کی زبان پر رواں ہو گئے۔

مرثیہ کی تعریف:

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے اور "رثی" سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی کی موت پر رونا۔ عربی میں صنف مرثیہ کے جو معنی مقرر ہوئے وہ اسطرح ہیں (1) کسی کی موت پر غم کا اظہار اور مرنے والے کے اوصاف کا بیان" سادہ طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ وہ نظم ہوتی ہے جس میں کسی کی موت پر اظہار غم کرتے ہوئے مرنے والے شخص کی خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کی قسمیں:

مرثیہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1) کربلائی مرثیہ (2) شخصی مرثیہ۔ میدان کربلا میں یزید کی فوج کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے جو مقدس ہستیاں شہید ہوئی ان کی شہادت اور موت پر لکھا جانے والا مرثیہ کربلائی مرثیہ کہلاتا ہے۔ ان مقدس ہستیوں میں حضرت حسین (رضی اللہ)

PAGE NO.:
DATE : / /

حضرت عباسؓ، حضرت علی اکبرؓ، علی اصغرؓ، حضرت قاسمؓ اور حضرت خرد وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات کی شہادت پر جو مرثیے لکھے گئے وہ کربلائی مرثیے کہلاتے ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ جس کسی شخص کی موت پر مرثیہ لکھا جائے وہ شخصی مرثیہ کہلاتا ہے۔ کوئی مذہبی شخصیت ہو، سیاسی و قومی لیڈر ہو، کوئی شاعر یا ادیب، استاد و شاگرد، ماں باپ، بھائی بہن، بیٹا یا دوست ان میں سے کسی کی بھی موت پر اگر مرثیہ لکھا گیا ہو تو ایسے مرثیے کو شخصی مرثیہ کہا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی اس طرح ہیں:-

(1) چہرہ (2) سراپا (3) رخصت (4) آمد
(5) رجز (6) جنگ (7) شہادت (8) بین

(1) چہرہ:

یہ مرثیہ کی تمہید ہوتی ہے اکثر مرثیوں کا آغاز حمد، نعت، منقبت اور مناجات سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شاعر اس حصہ میں اپنے کلام کی خوبیوں کا ذکر کرتا ہے کبھی کبھی صبح کا منظر، دھوپ کی شدت یا کوئی اور منظر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مدینے سے کوفہ تک سفر کی مشکلات کا بیان بھی اس حصہ میں کیا جاتا ہے۔ غرض چہرہ مرثیہ کی تمہید ہے جس میں تمہید کے طور پر مندرجہ بالا بیانات میں سے کوئی بھی بیان ہو سکتا ہے۔

(2) سراپا:

اس حصہ میں جنگ میں شہید ہونے والے بہادروں کے قد و قامت (پرسنالٹی) کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ اس کی صورت و شکل اور اس کے بازو اس کا سینہ غرض مرثیہ کے ہیرو کی مکمل جسمانی ساخت کی تصویر کشی اس حصہ میں کی جاتی ہے۔ سراپا کے معنی (ہیں) ہیں "سر سے لے کر پیر تک ہے"۔

PAGE NO.:
DATE: / /

(3) رخصت:

میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے مرثیہ کا ہیرو اپنے افرادِ خاندان سے آخری ملاقات کرنے کیلئے آتا ہے۔ اس حصے میں اسی آخری ملاقات کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کا ہیرو جنگی لباس پہن کر ہاتھ میں تلوار تھامے اپنے افرادِ خاندان سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت چاہتا ہے

(4) آمد:

مرثیے کے اس حصے میں یہ بتایا جاتا تھا کہ مرثیہ کا ہیرو کس بہادری اور بے خوفی اور شان و شوکت کے ساتھ میدان جنگ میں آتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر یہ دکھاتا ہے کہ کیسی بہادر کے میدانِ جنگ میں پہنچنے سے کس طرح دشمن کی فوج میں خوف و ہراس پھیل جاتا ہے

(5) رجز:

قدیم عرب کی جنگ کا یہ طریقہ ہوتا تھا کہ لڑنے سے پہلے جنگ کرنے والے اپنی اور اپنے خاندان اور قبیلہ کی بہادری کے کارنامے فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے۔ غرض اس حصے میں ہیرو کی زبان سے فخریہ اشعار بیان کروائے جاتے ہیں۔ ہیرو میدان جنگ میں پہنچ کر دشمن کو للکارتا ہے۔ فخریہ طور پر اپنے اور

Scanned by CamScanner

PAGE NO.:
DATE: / /

اپنے بزرگوں کی بہادری کے کارناموں کا بیان کر کے دشمن کے حوصلے پست کرنے کی کوشش کرتا ہے

(6) جنگ (رزم) :-

یہ مرثیہ کا مرکزی حصہ ہوتا ہے۔
اس حصے میں جنگ کا منظر بیان کیا جاتا ہے۔ تلواروں کی جھنکار، گھوڑوں کی آواز، گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف، دشمن پر حملہ کرنے کا انداز اور گھوڑے پر سے لاشوں کا کٹ کٹ کر گرنا وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔
غرض اس حصے میں مرثیہ نگار اپنے زورِ بیان سے میدانِ جنگ کا ایسا نقشہ کھینچتا ہے کہ اس سے ہماری آنکھوں کے سامنے میدانِ جنگ کی مکمل تصویر آ جاتی ہے
یہ مرثیے کا طویل جز ہوتا ہے۔ اس جز کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش ہمارے مرثیہ نگاروں نے بڑی مہارت کے ساتھ جنگ کے جیتے جاگتے مرقعے (تصویریں) پیش کیے ہیں اور فنِ سپہ گری سے اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔

(7) شہادت :-

مجاہد کا بہادری کے ساتھ جنگ کرتے کرتے دشمنوں کے نرغے میں گھر جانا، زخموں سے چور چور ہونا اور آخر کار شہید ہو جانا۔ یہ تمام باتیں اس حصے

Scanned by CamScanner

میں نہایت دردناک اور اثر انگیزی کے ساتھ اسے بیان کی جاتی ہیں کہ مرثیہ پڑھنے یا سننے والوں کی آنکھوں سے خود بخود آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

8) بین :-

یہ مرثیے کا سب سے آخری حصہ ہوتا ہے۔ شہادت کے بعد شہید کے اہل و عیال اور عزیز و اقارب اس کی میت کے گرد بین اور آہ و بکا کرتے ہیں۔ مرثیہ کا یہ حصہ بہت پر اثر ہوتا ہے اور مرثیہ پڑھنے یا سننے والوں کیلئے اپنے آنسو روکنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔

یہ اجزائے ترکیبی کربلائی مرثیوں کیلئے مخصوص ہیں۔ شخصی مرثیوں کیلئے نہیں۔ کیونکہ شخصی مرثیے میدانِ کربلا میں شہید ہونے والوں پر نہیں بلکہ سماج کے دیگر لوگوں کی اموات پر لکھے جاتے ہیں۔ مرثیہ کے یہ اجزائے ترکیبی میر ضمیر نے مقرر کیے۔ ورنہ اس سے قبل اسطرح کے اجزائے ترکیبی نہیں تھے۔ میر ضمیر کا زمانہ انیس اور دبیر سے پہلا کا ہے۔

اردو مرثیہ کا آغاز و ارتقا

دکن میں مرثیہ کا آغاز:

اردو کی خیلر دیگر اصناف سخن کی طرح مرثیہ کا آغاز بھی دکن کی قدیم سرزمین سے ہوا۔ دکن کی قدیم مملکت سلطنت "بہمنی سلطنت" تھا۔ بہمنی سلطنت کے اکثر بادشاہ شیعہ مذہب رکھنے والے تھے۔ اگر کچھ بادشاہ شیعہ مذہب کے نہیں تھے تو ان کی طبیعت شیعہ مذہب کی طرف مائل تھی۔ اس وجہ سے دکن میں حضرت حسینؓ کو خراج عقیدت پیش کرنے کا رجحان یہاں کے شاعروں میں بڑھتا چلا گیا۔ ایرانی علماء کے دکن میں آنے سے بھی اس رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ محرم میں باقاعدہ مرثیہ خوانی کی مجلسوں کا اہتمام ہونے لگا۔ قطب شاہی سلطنت کے بادشاہ بھی شیعہ تھے۔ قطب شاہی دور میں مرثیہ گوئی کو مزید تقویت ملی۔ اس خاندان کا پانچواں حکمراں محمد قلی قطب شاہ ہے جو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ قلی قطب شاہ بذات خود مرثیہ گو شاعر تھا۔ وہ محرم کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا اشعار سنتا اور خود بھی سناتا تھا۔ قطب شاہی دور میں کے مشہور شاعر ملا وجہی نے بھی مرثیے لکھے۔ ان سے قبل برہان الدین جانم جیسے صوفی شاعر نے بھی اس صنف میں دلچسپی لی۔ دکن کے قدیم مرثیہ نگاروں میں غواصی اور ابوالحسن قطب شاہ کا بھی شمار ہوتا

عبداللہ

یہ گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنت میں جتنے بھی مرثیہ لکھے گئے وہ قدیم دکنی زبان کا نمایاں نمونہ ہیں۔ مگر ان کی ادبی اہمیت مسلّم ہے۔ ان میں سوز و گداز اور شیرینی پائی جاتی ہے گول کنڈہ میں مرثیہ نگاری کو فروغ دینے میں اس خاندان کے آخری حکمران ابوالحسن تاناشاہ نے بھی حصہ لیا۔ اس دور کے تقریباً تمام مرثیے غزل کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔ یہ تمام شعراء مرثیہ نگاری کو ادبی صنف کے علاوہ ثوابِ دارین کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔

دکن کی دوسری بڑی سلطنت

عادل شاہی سلطنت تھی جس کا پایہ تخت بیجاپور تھا۔ عادل شاہی دورِ حکومت میں بھی مرثیہ نگاری کے فن کو ترقی حاصل ہوئی۔ اس سلطنت کے تقریباً تمام بادشاہ شاعر تھے اور شاعری کی قدر بھی کرتے تھے۔ عادل شاہی دورِ حکومت کے مشہور شاعروں میں نصرتی، قادر اور ایاغی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مرثیہ نگاری میں طبع آزمائی کی۔ اسی دور کا ایک اہم شاعر مرزا بیجاپوری بھی ہے۔ اس دور کے مرثیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرثیے کے موضوعات میں وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ شہادت کا واقعہ تو بیان ہوتا ہی تھا۔ مگر اب گھوڑے اور تلوار کی

Scanned by CamScanner

تعریف رجز وغیرہ کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی تھی
زبان اور انداز بیان میں بھی روانی آ گئی تھی۔

جب دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کے خاتمہ کے بعد اورنگ زیب کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو مراثی کے محفلوں میں بادشاہ وقت کی موجودگی بھی روایت ختم ہو گئی۔ مگر مرثیے بہ دستور لکھے جاتے رہے۔ عزاخانوں میں مجلسیں بھی منعقد ہوتی رہیں۔ اس زمانے کے اہم مرثیہ گو شاعروں میں جنون، ذوقی، اشرف اور نادم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دکن میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور آصف جاہی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی ایک بار پھر محرم اور عزاداری (ماتم کرنا) کے سارے رسوم حسب سابق جاری ہو گئے۔ اس دور کے اہم مرثیہ نگار شعرا لطف علی خان، ہمت علی خان ہمت، شاہ تجلی، علی محمد، مولانا احسن اور کاظم علی کاظم ہیں۔ ان شعرائے دکن میں مرثیے کی صنف کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

شمالی ہند میں مرثیہ نگاری :

دکن کے مقابلے میں شمالی ہندوستان میں مرثیہ نگاری بہت بعد میں شروع ہوئی۔ مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر، مسکین، غمگین، محمد تقی، نظر علی، اللہ، اثر، میاں آن، عاجز اور جعفر علی حسرت کا شمار شمالی ہند کے اولین مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان سب میں محمد رفیع سودا کئی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ سودا کے مرثیوں میں وہ بات تو نہیں جو ان کے قصائد میں ہے، لیکن پھر بھی ان کے مرثیوں کی اہمیت ہے ایک تو اس وجہ سے کہ یہ سودا جیسے مشہور شاعر کا کلام ہے دوسرے اس لیے کہ انھوں نے دیگر شعرا کی طرح حصول ثواب کی خاطر مرثیہ کو اپنانے کے باوجود انھوں نے اس کے ادبی پہلو کو بھی پیش نظر رکھا تھا۔

غزل کے مشہور شاعر خدائے سخن میر تقی میر نے بھی صنف مرثیہ میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کے مراثی معمولی درجے کے ہیں۔ ان سے کہیں بہتر مرثیے سودا کے ہاں ہیں۔ اس دور کے دیگر مرثیہ گو شاعروں میں فدا، حک، احسان، فصیح، خلیق، ضمیر اور دلگیر قابل ذکر ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں فرق (جنگلی) کا عنصر زیادہ
پایا جاتا ہے۔ دلگیر نے زبان کی صفائی اور ربط زیادہ
کا خاص خیال رکھا۔ دلگیر کے مراثی میں
سوز و گداز بھی زیادہ پایا جاتا ہے۔ اب تک مرثیہ
غزل کی ہیئت (شکل) میں یا مخمس کی ہیئت
میں لکھے جاتے تھے۔ مخمس وہ نظم ہوتی ہے جس
کے ہر بند میں پانچ پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔ اگرچہ
سودا کے زمانے میں مرثیہ کو مسدس کی ہیئت
میں لکھنے کا رواج ہو چکا تھا۔ لیکن تمام شعرا اس
کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ مسدس وہ نظم ہوتی
ہے جس کے ہر بند میں چھ چھ (6) مصرعے ہوتے
ہیں۔ میر ضمیر اور خلیق نے مرثیہ کے لیے مسدس
کی ہیئت کو نہ صرف لازمی طور پر اپنایا بلکہ مرثیہ
کو شاعری کے محاسن (خوبیاں) بھی بخشے۔
میر ضمیر نے مرثیہ میں ربط و تسلسل پر زور دیا۔
اس وقت تک مرثیہ نگاری میں سیرت نگاری،
جذبات نگاری اور مکالمہ نگاری کی طرف
توجہ دی جانے لگی تھی۔ اسی دور میں مرثیہ کے
اجزائے ترکیبی بھی مقرر کیے گئے۔ اس کارنامے کا
سہرا میر ضمیر کے سر ہے۔ میر ضمیر نے واقعۂ کربلا
سے متعلق تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی مرثیہ میں جگہ
دی۔ میر ضمیر کی انھیں خدمات کے پیش نظر
مسعود حسین لکھوی نے انھیں انیس و دبیر کے لیے

DATE :

راستہ ہموار کرنے والا ثابت ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگر ضمیر نہ ہوتے تو دبیر کا وجود ہوتا نہ انیس کا۔"

ضمیر اور خلیق کے بعد مرثیہ گوئی کی تاریخ کے دو بڑے نام انیس و دبیر ہیں۔ انھوں نے مرثیے کے فن کو اس بلندی تک پہنچا دیا جہاں تک کوئی صنف سخن پہنچ سکتی ہے۔

ضمیر نے مرثیے کیلئے جو نئی راہیں تلاش کی تھیں اُن پر مرزا دبیر نے فن کے کئی چراغ روشن کئے۔ اُن کا مطالعہ وسیع تھا۔ مذہب سے گہری دلچسپی تھی۔ اور مزاج عالمانہ تھا۔ اسی لئے ان کے مرثیوں میں جگہ جگہ علمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ دبیر کے مرثیوں میں فصاحت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

دبیر کے ہم عصر انیس کا شمار بھی اردو کے بڑے مرثیہ نگار شاعروں میں ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انیس اور دبیر دونوں ہی مرثیہ نگاری کے فن کے امام گزرے ہیں۔ ان دونوں شاعروں نے مرثیہ نگاری سے فن کو بے حد بلندی عطا کی۔ میر انیس کا مشاہدہ گہرا ہے، جمالیاتی ذوق اعلیٰ ہے، زبان صاف ستھری ہے، مصرعہ رواں دواں اور انداز بیان بہت دلکش ہے۔ اُن کے پاس الفاظ کا ایک خزانہ ہے جس سے وہ حسب ضرورت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ جانتے

PAGE NO.:
DATE: / /

ہیں کہ کس موقع پر کونسا لفظ مناسب ہے۔ انیس اور دبیر کی مرثیہ نگاری کا شبلی نعمانی نے اپنی مشہور کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" میں ان دونوں شاعروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور یہ فیصلہ دیا ہے کہ دونوں ہی بڑے شاعر ہیں۔ دبیر کے پاس فصاحت زیادہ ہے اور انیس کے پاس بلاغت۔

مرثیہ نگاری کے فن کو لکھنؤ میں زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ لکھنؤ شیعہ مذہب کے پیروکاروں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ مرثیہ لکھنا، پڑھنا اور سننا شیعہ مذہب میں عبادت کا درجہ ہے۔ انیس اور دبیر کے بعد لکھنؤ میں مرثیہ نگار شاعروں کی طویل فہرست ہے، جنھوں نے مرثیہ کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔

جدید دور کے مرثیہ نگاروں میں جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، نسیم امروہوی، نجم آفندی اور وحید اختر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جوش ملیح آبادی اور وحید اختر نے اس دور میں مرثیہ نگاری کے فن کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی۔ اس دور میں مرثیہ واقعۂ کربلا کے ذکر تک محدود نہ رہا۔ بلکہ امام حسینؓ کی ذات صبر و تحمل، تسلیم و رضا، جرأت و ہمت اور انسانیت و شرافت کی علامت بن گئی۔ اب مرثیہ صرف مظلوم حسینؓ تک محدود نہ رہا بلکہ مظلوم انسانیت

PAGE NO.:
DATE: / /

بھی اس کے دائرے میں آ گئی۔ غزل کی طرح مرثیہ کے دائرے میں بھی پھیلاؤ آ گیا۔

دورِ حاضر کے مرثیوں میں زمانہ اور زندگی کی سفاکیوں کو ایک نئے انداز سے پیش کیا جانے لگا۔ ساری مظلوم انسانیت اس کا موضوع بن گئی۔ اور حضرت امام حسینؓ اس مظلوم انسانیت کی زبردست علامت بن گئے۔ جدید مرثیہ نگاروں نے شخصی مرثیے بھی لکھے ہیں جن میں کسی عزیز و رفیق یا کسی مشہور ادبی و سیاسی شخصیت کے اوصاف اخلاق اور مقام و مرتبہ کو موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ کے ساتھ آج بھی جو حضرت امام حسینؓ کا واقعہ کربلا اور رفقائے حسینؓ کی بے مثال قربانی کا تصور ہی سب سے پہلے ذہن کی سطح پر ابھرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان مرثیہ نگاروں کے نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں جنھوں نے اس موضوع کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔

مرثیہ حالی کا تنقیدی جائزہ

صفی لکھنوی

خواجہ الطاف حسین حالی اردو کے مشہور شاعر، ادیب، سوانح نگار، نقاد اور مصلح قوم تھے۔ حالی پھریانہ کے ایک ضلع پانی پت میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں دہلی آئے۔ دہلی میں غالب کے شاگرد ہو گئے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بھی فیض اٹھایا اور سرسید کی علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر اپنی ساری زندگی قوم کی فلاح و بہبودی اور اردو زبان و ادب کی ترقی میں دینے میں گزار دی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنے اور جدید تعلیم سے آراستہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ حالی قوم کے مجدد تھے۔ ان کے اخلاق و آداب فرشتوں جیسے تھے۔ وہ بہت نیک، سنجیدہ، مخلص اور شریف انسان تھے۔ الطاف حسین حالی کی وفات پر ان کے شاگرد صفی لکھنوی نے یہ مرثیہ لکھ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

صفی لکھنوی نے اس مرثیہ میں حالی کی مختلف قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی موت پر اپنے غم کا اظہار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کھوٹوں کو کھری سنانے والا، سوتی ہوئی قوم کو جگانے والا آج خاموش اپنی قبر میں سو رہا ہے اور زمانہ اس کی جدائی میں رو رہا ہے۔

Scanned by CamScanner

شیخ سعدی اور عطار فارسی زبان کے دو مشہور شاعر
گزرے ہیں جو ایران کے رہنے والے تھے۔ ان کی شاعری
میں علم و حکمت اور مذہب و اخلاق کی باتیں ہوا
کرتی تھیں۔ حالی کی شاعری میں بھی یہی خصوصیات
تھیں۔ اسی لیے صفی لکھنوی نے حالی کو اس صدی کا
سعدی اور عطار کہا ہے۔ حالی انتہائی نیک اور فرشتہ
صفت انسان تھے۔ ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔
ان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کے سب لوگ قائل تھے۔
اسی لیے صفی نے حالی کو انسان کے روپ میں فرشتہ
کہا ہے
صفی نے حالی کی شعری و نثری
خدمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھیں "اقلیم سخن کا
بابِ عالی" یعنی شاعری کی سلطنت کا بڑا دربار
کہا ہے اور بڑی عقیدت سے ان کی خدمات کو خراج تحسین
پیش کیا ہے۔ حالی نے "مدوجزر اسلام" نامی ایک
مشہور نظم لکھ کر مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا
تھا۔ یہ نظم "مسدس حالی" کے نام سے بھی مشہور ہے
اور بہت طویل ہے۔ اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے صفی نے
کہا ہے کہ حالی نے کتنی راتیں جاگ کر اور قوم کے غم میں
گھل گھل کر یہ نظم لکھی تھی۔ حالی کا کلام سیدھا سادہ
اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے
ذریعہ مردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ صفی نے ان
تمام باتوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔

Scanned by CamScanner

اس مرثیہ میں حالی کو "یادگار غالب"
اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے صرف
اتنا ہی نہیں انھوں نے غالب کے شاعرانہ کمالات
اور عظمت کو واضح کرتے ہوئے حالی نے یادگار غالب
کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ یہی وہ کتاب ہے جس
کے ذریعے دنیا والے غالب کی شاعرانہ عظمت کو سمجھ
سکے اسی بات کے پیش نظر صفی نے یہ کہا ہے کہ حالی کے
دم سے ہے بہار غالب برقرار ہے وہ افسوس ظاہر کرتے
ہوئے کہتے ہیں کہ ایسا مخلص اور نیک شخص دنیا سے اٹھ
گیا۔

حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری"
نام کی کتاب لکھ کر اردو شاعروں اور ادیبوں کو صحیح راستہ
دکھایا تھا۔ اس لیے انھیں "خضر ادب" کہا گیا ہے
مرثیے میں بتایا گیا ہے کہ حالی نے نظم و نثر دونوں
میدانوں میں بڑی خدمت انجام دی۔ حالی کے اخلاق
و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے صفی نے کہا ہے کہ حالی
انتہائی مخلص "پاک باطن اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ تھے
وہ جس محفل میں بیٹھتے اس کی زینت بن جاتے تھے
حالی سر سید احمد خاں کے خاص مددگاروں
اور ان کی تعلیمی ~~تحریک میں~~ و اصلاحی تحریک میں سب
سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صفی نے
حالی کو سر سید کے نو رتنوں میں سے ایک رتن کہا ہے۔
سر سید کے تمام ساتھی ایک سے ایک قابل تھے لیکن ان میں

Scanned by CamScanner

PAGE NO.:
DATE: / /

حالی سب سے نمایاں تھے۔ وہ نرم مزاج اور
"صلح کل" کا نظریہ رکھنے والے قومی رہنما تھے۔ افسوس کہ
آج دنیا سے مخلص رہنما چلا گیا۔ مرثیہ نگار کے
خیال میں یہ بات ایسی ہی ہے جیسے مے خانہ تو اپنی
جگہ برقرار ہے۔ لیکن اس میں ساقی موجود نہیں۔ اور
مے خانہ کی ساری رونق ساقی سے قائم رہتی ہے۔
اس طرح صفی نے حالی کی وفات پر
ان کی قومی اور ادبی خدمات اور اعلیٰ اخلاق و کردار
کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے شدید غم کا اظہار کیا ہے۔
"مرثیۂ حالی" شخصی مرثیے کی تاریخ میں ایک اہم
مرثیہ ہے۔

Scanned by CamScanner

الطاف حسین حالی

مرثیہ غالب

PAGE NO.:
DATE :

تعارف:

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت میں 1837 میں پیدا ہوئے۔ وہ انصاریوں کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پانی پت کی فضا اس خاندان میں تھی۔ ان کے والد خواجہ ایزو بخش صوفی منش آدمی تھے۔ حالی نو سال کی عمر میں یتیم ہو گئے والد کے انتقال کے بعد بڑے بھائی اور بہن نے ان کی پرورش کی۔ زمانہ دستور کے مطابق عربی و فارسی سے سلسلہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ قرآن بھی حفظ کیا۔ ابھی سلسلہ تعلیم ختم نہیں ہوا تھا کہ سترہ برس کی عمر میں انکی شادی کر دی گئی۔ لیکن ابھی تعلیم کی دھن سوار تھی چنانچہ پانی پت سے دہلی چلے گئے۔

مولانا الطاف حسین حالی 1853 میں جب پہلی مرتبہ گھر سے بتائے بغیر تعلیم حاصل کرنے کیلئے دہلی پہنچے تو اس وقت دہلی کی ادبی فضا، ذوق، غالب، مومن، صہبائی اور شیفتہ جیسے بلند پایہ شعراء کے کلام سے گونج رہی تھی۔ حالی نے دہلی پہنچ کر مرزا غالب جیسے روشن دماغ نکتہ شناس اور یکتائے روزگار استادِ سخن کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔

حالی کوئی ڈیڑھ دو سال تک دلّی میں رہے انھوں نے مرزا غالب سے اردو اور فارسی کلام پڑھا۔ حالی، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے

Scanned by CamScanner

DATE : / /

وہ غالب کے کمال فن اور فارسی دانی کے معترف تھے۔ غالب میں انھوں نے وہ تمام خوبیاں پائیں جو ان کے ادبی ذوق کی تشفی کر سکتی تھیں۔ حالی جب لڑکے بھائی کے اصرار پر 1855 میں پانی پت واپس ہوئے۔ یوں تو وہ غالب سے دور ہوئے لیکن انھیں غالب سے جو تعلق خاطر تھا وہ برابر قائم رہا۔ جب مولانا حالی شیفتہ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہو کر جہانگیر آباد آگئے تو غالب سے عقیدت اور محبت کی وجہ سے ان سے ملاقات کی غرض سے دلی جایا کرتے تھے۔ چنانچہ بعد میں انھوں نے "یادگارِ غالب" کے نام سے سوانح لکھا۔

1869 میں جب مرزا غالب کا انتقال ہوا تو اس وقت حالی دلی میں موجود تھے۔ انھیں غالب سے بے انتہا محبت اور عقیدت تھی۔ غالب کی موت ان کیلئے ایک بڑا شخصی صدمہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے انتقال پر حالی کا لکھا ہوا مرثیہ ان کے واردات قلبی کا ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرثیہ اردو ادب کے منتخب شخصی مرثیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

مرثیہ غالب کا تنقیدی جائزہ

PAGE NO.:
DATE: / /

الطاف حسین حالی

"مرثیہ غالب" لکھ کر بند بند میں مولانا حالی اس دنیا اور زندگی سے بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں اپنے دل میں چھپے درد و غم کو کس طرح بیان کروں۔ میرے غم کی داستان بہت طویل ہے اور وقت بہت کم۔ حالی کہتے ہیں کہ اس فانی دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر میرا دل اس دنیا کے عیش سے سرد ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہاں چاہے بزم سلطانی ہو یا فقیروں کا تکیہ ہو سب کچھ خواب و خیال کے سوا کچھ نہیں۔ اس فانی دنیا میں زندگی ایک سراب ہے یہاں زندگی میں کوئی مزہ نہیں۔

غالب کی شخصیت ہندوستان کے باغ میں ایک بلبل کی سی تھی اور افسوس صد افسوس کہ وہ بلبل یہاں نہیں رہا۔ جس کی ہر بات میں ایک گہرا خیال اور نکتہ پوشیدہ ہوتا تھا۔ وہ ایک ہستی تھی جو ہندوستان میں نکتہ داں، نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھی وہ پاک دل پاک صفات کے حامل تھے۔ ان کا مذاق میں کہا ہوا ایک جملہ بھی لاکھوں مضامین پر بھاری تھا۔ دوسرے لاکھ تکلف کرتے لیکن ان کی ایک سیدھی سادی بات سب پر بھاری تھی۔ دلی میں صرف ان ہی کی باتیں ایسی تھیں جن کو میں اپنے وطن کو سوغات کی طرح لے جاتا اب اگر وطن

Scanned by CamScanner

DATE: / /

کو جاؤں تو احباب کے لیے کیا تحفہ لے جاؤں۔ ان کے مرنے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلی مرگئی کیونکہ یہاں ان کی ملیتی براءت میں نوشہ کی طرح تھی۔ جب نوشہ ہی نہ ہو تو یہ براءت کس کام کی۔ دلی میں ان ہی کی ایک بزم تھی جو ان کی ذات سے بارونق تھی۔ اب ان کے نہ رہنے سے دلی کی محفلوں کی رونق نہ رہی۔ ان کی ذات ایک روشن دماغ کی تھی۔ جس کی وجہ سے سب کو روشنی ملتی تھی افسوس کہ اب وہ شخصیت نہ رہی گویا کہ شہر میں ایک چراغ تھا جواب نہ رہا اس لیے اب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

غالب کی باتوں سے دلی میں ہمارا دل لگتا تھا اب اگر ان کی باتیں یاد آئیں تو کس کی باتوں سے دل بہلائیں اب کوئی ان جیسا نہ رہا۔ اب ہم کس کو جاکر اپنے شعر و غزل سنائیں۔ غالب ہی کی ایک ایسی ہستی تھی جو کلام کی باریکیوں سے واقف تھی اب ہم اپنے کلام کی داد کس سے پائیں۔ دوست و احباب ان کا مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ اب ہم کس سے اصلاح سخن لیں۔ ان کی زندگی میں ان سے اصلاح لیتے تھے اب کدھر جائیں اہل میت ابھی جنازہ کو کچھ دیر کے لیے ٹھہراؤ کہ ہم پوچھ لیں کہ ہم کدھر جائیں۔

مرزا غالب کی کثیر حسن و جمال اور سادگی کی وپرکاری سے آراستہ ہوتی اور ان کی نظم خوبصورت معشوق کے غمزہ ادا کی سی تھی۔ ان کی تہنیت میں جہاں نشاط کی کیفیت تھی تو تعزیت رنج و ملال سے پر ہوتی تھی۔ غالب کی شخصیت اس ادبی دنیا میں الوری اور کمال کے ہم پلہ تھی۔ اور آج کے بعد یہ زمانہ ان کی صورت میں نہ دیکھو

Scanned by CamScanner

پھر
سکے گا۔ اس لئے آج انھیں جی کر دیکھ لو پھر اس بے مثال صورت کو نہ دیکھ سکو گے

آج شہر میں تمام لوگ سوگوار ہیں۔ اپنے بھی اور بیگانے بھی آج غالب کی موت پر آنسو بہا رہے ہیں۔ کیونکہ جو سب احباب کے کام آتا تھا اور ان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا تھا آج دوسروں کے کندھوں پر اس کا جنازہ ہے۔ زندگی میں اس کی ہر بات دل میں اتر جاتی تھی آج وہ چپ ہوگئی ہے تو سب کے دل و جگر پھٹے جا رہے ہیں۔ آج ہمارے دلوں کو تسکین دینے والا کوئی نہ رہا۔ کیونکہ غالب ہی کی ایک ذات اس دنیا میں ایسی تھی جو غمخوار و غم گسار تھی۔ اب ہم اسی کا ماتم کر رہے ہیں۔ قبر کو بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ آج کسی ملک گردوں نگار شخصیت کو دفن کرنے لایا جا رہا ہے اس لئے وہ بھی ہمہ تن انتظار کر رہی ہے۔ ہائے کیا کہیں جا کر کہ آج ہمارے دل ناشاد کو کسی طرح قرار آتا ہی نہیں کہ جن کے دم سے یہ دنیا آباد تھی اسی ہستی سے آج دلی خالی ہوگئی۔

ایسا کونسا ہنر ہے ایسی کونسی خوبی ہے جو غالب کی ذات میں نہ تھی یہ اور بات کہ اس بے مروت زمانے نے ان کی قدر نہ کی۔ انھیں اس زندگی میں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ ناقدری زمانہ سے تنگ آ چکے تھے۔ اپنی جان بھی دے دیتے لیکن جان دینا بھی کسی کا بس ہے۔ وہ عجز و انکسار کرنے والوں کو عزیز رکھتے اور ان کے ساتھ بھی انکسار سے پیش آتے لیکن غرور کرنے والوں سے ملتے بھی نہ تھے

Scanned by CamScanner

PAGE NO.:
DATE: / /

مولانا حالی کہتے ہیں کہ غالب سے ملنے کیلئے ہم دلی آتے تھے ان کی شخصیت میں ایک کشش تھی۔ جو ہمیں دلی کھینچ لاتی اب وہی نہ رہے تو اب دلی سے جا کر کون لوٹ آئے گا۔ اب دلی میں فہم و سخن کا قدردان نہ رہا اب کون ہمیں اپنے اشعار سنائے گا۔ جس سے ہمارے ذوق سخن کی تسکین ہو سکے۔ مرزا غالب کی شخصیت اس بساطِ سخن کی ماہر کی سی تھی اب ہمیں اس بساط کے رمز کون بتائے گا۔ اب کون ہمیں شاعری کے رموز و نکات سمجھائے گا۔ آخر میں حالی کہتے ہیں کہ میں ابھی شاعری کے رموز و نکات سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ ابھی فن شاعری میں ہماری حیثیت ناتمام کی سی ہے اب کون ہمیں اپنی اصلاح دے گا اور غزل میں اپنی اصلاح سے جان ڈال دے گا۔

PAGE NO.:
DATE: / /

رباعی کی تعریف، فن اور ہیئت

لفظ 'رباعی' عربی لفظ "ربع" سے مشتق (ماخوذ) ہے۔ جس کا معنی ہے چار۔ رباعی میں صرف چار مصرعے ہوتے ہیں اس لیے اس صنف کا نام رباعی پڑا۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رباعی چار مصرعوں والی نظم ہوتی ہے۔ لیکن ہر چار مصرعے والی نظم کو رباعی نہیں کہتے بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ چار مصرعے رباعی کے مخصوص اوزان میں لکھے گئے ہوں۔ اور اس کے پہلا، دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیے کا استعمال کیا گیا ہو۔ اب آسان لفظوں میں رباعی کی تعریف یہ ہوئی کہ وہ چار مصرعے جو رباعی کے مخصوص وزن میں لکھے گئے ہوں جن کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ ہو اور ان چاروں مصرعوں میں ایک مکمل اور مربوط خیال پیش کیا گیا ہو۔

رباعی کے (24) چوبیس اوزان مقرر کیے گئے ہیں۔ جو "بحر ہزج" سے نکلتے ہیں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ رباعی کے سینکڑوں اوزان ہیں لیکن زیادہ تر چوبیس اوزان ہی مستعمل ہیں۔ ان چوبیس اوزان میں سے ایک وزن سب سے زیادہ مقبول ہے اس مقبول عام وزن کو یاد رکھنے کے لیے عربی زبان کا یہ فقرہ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" یاد

Scanned by CamScanner

DATE : / /

رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ فقرہ رباعی کے مقبول عام
وزن "مفعول" مفاعیل، مفاعیلن، فاع میں ہے"
رباعی کے چاروں مصرعے ان چوبیس
اوزان میں سے کسی ایک پر ہوں یا ایک ایک اوزان
میں ہوں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ
چاروں مصرعے ان چوبیس اوزان میں سے ہی ہوں۔
رباعی کو ترانہ، دوبیتی اور چاربیتی بھی کہا جاتا ہے
لیکن آج کل اسے رباعی ہی کہتے ہیں

رباعی چار مصرعوں پر مشتمل مختصر نظم
ہوتی ہے۔ اس مختصر نظم میں ایک مکمل اور مربوط خیال
اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ پہلا مصرعہ سے بات
شروع ہو کر جب تیسرے مصرعے پر آتی ہے تب بھی خیال
پوری طرح سے واضح نہیں ہوتا جب چوتھا مصرع پڑھا
جائے تو خیال پوری طرح سے واضح ہو جاتا ہے۔
رباعی کے ماہرین نے کہا ہے کہ رباعی کا چوتھا مصرع
نہایت شاندار، جاندار اور متاثر کن ہونا چاہیئے
تاکہ سننے والے کے دل پر اس کا اچھا اثر قائم ہو۔
رباعی کے لیے موضوعات کی کوئی قید
نہیں کسی بھی موضوع پر رباعی کہی جا سکتی ہے
لیکن عام طور پر رباعیات میں علم و حکمت، اخلاق
و نصیحت کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ فلسفیانہ
خیالات اور عارفانہ مضامین بھی رباعیات میں

Scanned by CamScanner

DATE :

کر دیے جاتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، آخرت کا خیال،
بہادری اور شجاعت کی تعریف، بزدلی اور کم ہمتی
کی برائی جیسے مضامین بھی رباعی کا حصہ ہوتے ہیں
عشق و محبت اور مے خواری کے مضامین بھی رباعیات
میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ انیس اور دبیر نے
رباعی میں مرثیہ کے مضامین بھی استعمال کیے ہیں۔
جوش کی رباعیات خمریات اور عشق و مستی کا
نمونہ ہیں۔ تو امجد حیدر آبادی کی رباعیات میں
اخلاق اور تصوف کے اعلیٰ مضامین نظر آتے
ہیں۔ غرض رباعی کے بے شمار موضوعات ہیں
لیکن اخلاق و تصوف، فلسفیانہ اور عارفانہ خیالات
رباعی میں خاص لطف دیتے ہیں۔

اردو رباعی کا آغاز و ارتقا

رباعی عربی لفظ "ربع" سے مشتق ہے۔ لیکن عربی زبان میں رباعی کا وجود نہیں ہے۔ رباعی کی ایجاد ایران میں ہوئی جہاں کی زبان فارسی ہے۔ فارسی کے شاعر رودکی کو رباعی کا موجد کہا جاتا ہے۔ فارسی زبان میں رباعی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ فارسی میں کئی نامی گرامی شاعروں نے رباعی گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ فارسی سے یہ صنف اردو میں آئی۔

اب تک کی تحقیقات سے یہ بات چلا ہے کہ اردو کا پہلا رباعی گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے جسے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جاتا ہے قلی قطب شاہ کے بعد ملا وجہی، غواصی اور ابن نشاطی کے نام آتے ہیں۔ جنھوں نے اردو کے اس ابتدائی زمانے میں رباعی کی طرف توجہ دی قطب شاہی دور حکومت کے علاوہ بیجاپور میں قائم عادل شاہی حکومت میں بھی کچھ شاعروں نے رباعی کی طرف توجہ کی قطب شاہی اور عادل شاہی دور حکومت میں جو رباعیات لکھی گئی وہ دکنی زبان میں ہیں۔ جسے اردو کا قدیم روپ کہا جاتا ہے

قطب شاہی اور عادل شاہی دور حکومت کے بعد ولی اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی اور داؤد اورنگ آبادی نے اردو شاعروں کے

Scanned by CamScanner

DATE : / /

ابتدائی زمانے میں رباعی گوئی کو فروغ دیا۔

جب شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا آغاز ہوا تو وہاں بھی غزل کے ساتھ ساتھ رباعیات کہنے کی طرف وہاں کے شاعروں نے توجہ کی۔ لیکن شمالی ہندوستان کے ابتدائی دور میں زیادہ رباعیاں نہیں لکھی گئی۔ البتہ اس کے بعد کے دور میں خواجہ میر درد، مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر نے کچھ رباعیات لکھیں۔ درد کے دیوان میں 32 سے 33 رباعیات نظر آتی ہیں۔ سودا کے پاس بھی قابل ذکر رباعیات ملتی ہیں لیکن سودا کی رباعیات میں وہ بات نہیں ہے جو درد کی رباعیات میں نظر آتی ہے۔ درد کی رباعیات میں تصوف کے مضامین ہونے کی وجہ سے یہ رباعیات بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں۔

میر تقی میر کا شمار اردو کے بڑے غزل گو شاعروں میں ہوتا ہے انھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ میر کی کلیات میں تقریباً سو 100 رباعیات نظر آتی ہیں۔ میر کی رباعیوں میں بھی وہی سوز و گداز پایا جاتا ہے جو ان کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ میر تقی میر کے بعد اور بھی چھوٹے بڑے شاعر ایسے ہیں جن کے یہاں دو چار رباعیات نظر آتی ہیں۔ لکھنؤ کے خاص اور اہم شاعروں میں آتش، ناسخ، انشا اور جرأت کا شمار ہوتا ہے۔ ان

Scanned by CamScanner

شاعروں نے بھی اپنے ذوق کی وجہ سے اپنے اپنے رنگ کی رباعیات کہی ہیں۔ لیکن یہ شعراء رباعی کے ساتھ شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں۔ عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی اگرچہ نظم کا شاعر تھا لیکن اس کے پاس بھی بیس پچیس [25-20] رباعیات نظر آتی ہیں۔ جن میں اخلاقی اور واعظانہ مضامین کو نظم کیا گیا ہے۔

انیس، دبیر، غالب، مومن اور ذوق وغیرہ کا عہد رباعی کے لیے بہت ساز گار تھا۔ انیس و دبیر نے نہ صرف مرثیہ نگاری کے فن کو بلندی عطا کی بلکہ ان شاعروں نے اردو رباعی کو بھی فنی اور فکری اعتبار سے بلند مقام عطا کیا۔ انیس و دبیر لکھنؤ کے نہایت بڑے شاعر تھے۔ لکھنؤ میں جب ان دونوں شاعروں نے رباعی کی طرف توجہ کی تو ان کی تقلید کرتے ہوئے لکھنؤ کے اور شاعروں نے بھی رباعی گوئی کے میدان میں قدم رکھا۔ انیس و دبیر رباعیات میں اخلاقی مضامین کے علاوہ مرثیے کے مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انیس و دبیر نے رباعی کو اپنی کوششوں سے قابل قدر صنف سخن بنا دیا۔

دہلی میں اگرچہ غالب، مومن، ذوق، ظفر اور شیفتہ جیسے صاحب کمال شعراء موجود تھے۔ لیکن غزل کے آگے مومن کے علاوہ کسی نے

DATE: / /

رباعی کی جانب توجہ نہیں کی۔ غالب کے رباعی کل پندرہ سولہ [15-16] رباعیات ہوں گی۔ ظفر کے یہاں بھی رباعیات نظر نہیں آتی ہیں۔ ذوق کی رباعیات البتہ غالب سے بہتر ہیں۔ بہرحال اس وقت دہلی میں ذوق اور مومن اچھے رباعی گو شاعر گزرے ہیں۔

سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے دوران اکبر الہ آبادی اور الطاف حسین حالی نے رباعی کی طرف خاص طور پر توجہ دی۔ حالی کی تقریباً تمام رباعیات اخلاقی اور اصلاحی رنگ رکھتی ہیں۔ اکبر آبادی کی رباعیوں کا لہجہ بھی حالی کی طرح بلکہ ناصحانہ ہے لیکن ان دونوں کا اپنا اپنا انفرادی انداز ہے۔ حالی نے جس کام کو انتہائی سنجیدگی اور خاموشی سے انجام دیا۔ اکبر نے اسے طنز و ظرافت کی مدد سے پورا کیا۔ اکبر کی رباعیات میں طنز و مزاح کا پہلو غالب ہے۔

اسماعیل میرٹھی بچوں کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کی شاعری بھی اخلاقی نوعیت کی ہوتی ہے۔ غرض اسماعیل میرٹھی نے بھی اسی رنگ کی کچھ رباعیات کہی ہیں۔ تقریباً اسی دور میں پیارے صاحب رشید نے بھی رباعیات کہی ہیں۔ پیارے صاحب رشید رباعی کے لئے خاص ممتاز ہیں۔ امیر مینائی کی رباعیات زیادہ تر نعتیہ ہیں۔

Scanned by CamScanner